Al-Mīthāq ***(Research Journal of Islamic Theology)***
ISSN: 2791-0989 (P), 2791-0997 (E)
Volume 04, **Issue** 04, October - December 2025, **PP**: 159-174
Open Access at: https://almithaqjournal.org/

Article QR

غزوات وسرایا کے دعوتی اسلوب کا خصوصی مطالعہ: تفسیر بیان القرآن از ڈاکٹر اسرار احمد کی روشنی میں

A Special Study of the Preaching Methodology in the Ghazawāt and Sarāyā in the Light of Bayān al-Qurʾān by Dr. Israr Ahmad

1. Mahnaz Shouket
mahnazshouket786@gmail.com
PhD Scholar,
Department of Islamic Studies,
The Islamia University of Bahawalpur.

2. Dr. Muhammad Ilyas Khawaja
Assistant Professor,
Department of Arabic,
The Islamia University of Bahawalpur.

How to Cite: Mahnaz Shouket and Dr. Muhammad Ilyas Khawaja. 2025: "A Special Study of the Preaching Methodology in the Ghazawāt and Sarāyā in the Light of Bayān al-Qurʾān by Dr. Israr Ahmad". Al-*Mīthāq (Research Journal of Islamic Theology)* 4 (04): 159-174.

Article History:	**Received**: 03-12-2025	**Accepted**: 29-12-2025	**Published**: 31-12-2025

Copyright: **©The Authors**

Licensing: This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

Conflict of Interest: Author(s) declared no conflict of interest.

Abstract & Indexing

Publisher

HIRA INSTITUTE
of Social Sciences Research & Development

غزوات وسرایا کے دعوتی اسلوب کا خصوصی مطالعہ: تفسیر بیان القرآن از ڈاکٹر اسرار احمد کی روشنی میں

A Special Study of the Preaching Methodology in the Ghazawāt and Sarāyā in the Light of Bayān al-Qurʾān by Dr. Israr Ahmad

1. **Mahnaz Shouket**
PhD Scholar, Department of Islamic Studies, The Islamia University of Bahawalpur.
mahnazshouket786@gmail.com

2. **Dr. Muhammad Ilyas Khawaja**
Assistant Professor, Department of Arabic, The Islamia University of Bahawalpur.

Abstract

The Holy Qur'ān does not present the idea of salvation as limited to an individual alone; rather, it portrays the whole of humanity as part of a historical struggle. The climax of this historical struggle is the call towards Allāh (Da 'wah ilā Allāh), a responsibility entrusted to the Muslim Ummah from Prophet Adam (peace be upon him) to Prophet Muhammad (ﷺ). According to Dr. Israr Ahmed, understanding the continuity of this call towards Allah is the true objective of understanding the Qur'ān. According to Dr. Israr Ahmed, the purpose of the battles and expeditions (Ghazawāt and Sarāyā) was to establish an organized state system and to raise the Word of Allāh, so that the correct methodology of Islamic propagation could be built upon a proper structure. Thus, the Ghazawāt and Sarāyā were not merely military operations; rather, they were a living example of a collective struggle extending from the individual to the level of society as a whole.

Keywords: *Historical Struggle, Da'wah, Muslim Ummah, Ghazawāt and Sarāyā, Islamic State, Collective Societal Struggle.*

تمہید و تعارف

اسلامی تاریخ اور سیرتِ طیبہ کا مطالعہ اگر محض ایک تاریخی داستان کے طور پر کیا جائے تو وہ انسانیت کی حقیقی انقلابی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک نبی کریم ﷺ کی 23 سالہ مبارک زندگی کا اصل جوہر "انقلابی جدوجہد" ہے جس کا آغاز دعوت سے ہوا اور تکمیل غلبہ دین پر ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تمام علمی و دعوتی زندگی اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کی کہ اسلام محض چند عقائد، رسومات یا انفرادی عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل "دین" یعنی نظامِ زندگی ہے۔ ان کے نزدیک کسی بھی نظام کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زمین پر عملی طور پر نافذ ہو اور انسانی ساختہ نظاموں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے لیکچرز میں کثرت سے فرماتے تھے کہ دنیا میں بہت سے انقلابات آئے، جیسے فرانس کا سیاسی انقلاب یا روس کا معاشی انقلاب، لیکن محمد ﷺ کا برپا کردہ انقلاب تاریخِ انسانی کا واحد "کامل انقلاب" تھا جس نے انسان کے عقیدے سے لے کر ریاست کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچے تک ہر شے کو الٰہی ہدایت کے مطابق بدل کر رکھ دیا۔ اس انقلابی سفر میں دعوت و تبلیغ وہ بنیادی بیج تھے جس سے انقلابی جماعت کی آبیاری ہوئی، جبکہ غزوات و سرایا اس دعوت کی راہ میں حائل مادی رکاوٹوں کو ہٹانے اور حق کی گواہی کو عسکری و سیاسی بنیادوں پر فراہم کرنے کے منطقی مراحل تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ سیرتِ نبوی ﷺ کو ایک انقلابی تحریک کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد صرف اخلاقی اصلاح نہیں بلکہ اللہ کے دین کو غالب کرنا تھا، جیسا کہ قرآن مجید اعلان کرتا ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ۔[1]

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت اسلام کے انقلابی نصب العین کو واضح کرتی ہے، جس میں دعوت، جدوجہد اور بالآخر غلبۂ دین شامل ہے۔[2] دعوتِ اسلامی کی بنیاد قرآن مجید میں رکھی گئی ہے، جہاں انبیاء علیہم السلام کے مشن کو بنیادی طور پر دعوت الی اللہ قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔[3]

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور موعظت حسن کے ذریعے بلایئے۔

اس آیت میں دعوت کے اسلوب کو حکمت اور حسنِ نصیحت کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے، تاہم قرآن ہی میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ جب باطل مزاحمت پر اتر آئے تو محض دعوتِ لسانی کافی نہیں رہتی۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے مطابق مکی دور میں دعوت کا غالب پہلو تربیت اور تزکیہ تھا، جبکہ مدنی دور میں یہی دعوت ایک منظم جماعت اور ریاست کی صورت اختیار کر گئی۔ وہ لکھتے ہیں:

> مکہ میں دعوت فرد سازی تک محدود رہی، لیکن مدینہ میں یہی دعوت نظام سازی کی شکل اختیار کر گئی، اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔[4]

قرآن مجید میں جہاد کا حکم بھی اسی تدریجی دعوتی عمل کے نتیجے میں نازل ہوا:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا۔[5]

اجازت دی گئی جن لوگوں سے قتل و قتال کیا گیا (جہاد کی) کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس آیت کو اسلامی انقلاب میں فیصلہ کن موڑ قرار دیتے ہیں، کیونکہ یہاں سے دعوت محض نظری سطح پر نہیں رہی بلکہ عملی جدوجہد میں داخل ہو گئی۔[6] یہ قرآنی پس منظر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ غزوات و سرایا دعوتِ اسلامی کے خلاف نہیں بلکہ اسی کے فطری تسلسل تھے۔

سیرتِ نبوی ﷺ میں دعوت کے مراحل اور ان کا تدریجی ارتقا

سیرتِ رسول اللہ ﷺ کا مطالعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ دعوتِ اسلامی ایک تدریجی اور حکیمانہ عمل تھا، جس میں حالات، مخاطبین اور مرحلے کے تقاضوں کے مطابق حکمتِ عملی اختیار کی گئی۔ ابن ہشام کے مطابق مکی دور میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا مرکز توحید، آخرت اور اخلاقی تطہیر تھا، اور اس مرحلے میں کسی قسم کی عسکری مزاحمت یا تصادم کا حکم نہیں دیا گیا۔[7] یہی وہ دور تھا جسے ڈاکٹر اسرار احمدؒ "دعوتِ فردی اور تربیتِ نفوس" کا مرحلہ قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں کہ مکہ میں تیرہ برس کی جدوجہد کا اصل حاصل ایک ایسی جماعت کی تیاری تھا جو ایمان، صبر اور اطاعت میں اپنی مثال آپ ہو۔[8] ان کے نزدیک اگر یہ مرحلہ مکمل نہ ہوتا تو آگے چل کر اسلامی انقلاب کا تصور محض ایک خواب رہ جاتا۔ قرآن مجید نے اس مرحلے میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ۔[9]

سو صبر کیجیے یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد دعوتِ اسلامی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ واقدی کے مطابق مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے

سب سے پہلے مسجد کی تعمیر، مواخاتِ مدینہ اور میثاقِ مدینہ کے ذریعے ایک منظم اجتماعی ڈھانچہ قائم کیا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس مرحلے کو دعوت کا "تنظیمی اور اجتماعی ظہور" قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اب دعوت محض نظری نہیں رہی بلکہ ایک عملی نظام کی شکل اختیار کر گئی۔[10] اسی پس منظر میں قرآن مجید میں جہاد اور قتال کی اجازت دی گئی:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ۔[11]

اور ان سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین مکمل اللہ کا ہو کر رہے۔

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہاں "فتنہ" سے مراد وہ ظلم و جبر ہے جو لوگوں کو دین قبول کرنے سے روکتا تھا۔[12] ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس تفسیر کو بنیاد بناتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ اسلامی قتال کا مقصد جبر نہیں بلکہ جبر کا خاتمہ ہے تاکہ دعوتِ دین آزاد فضا میں پھیل سکے۔[13] یہی تدریجی ارتقا بعد ازاں سرایا اور غزوات کی صورت میں سامنے آیا، جو دعوتِ اسلامی کے عملی اور فیصلہ کن مراحل تھے۔ اس طرح سیرتِ نبوی ﷺ میں دعوت، تنظیم اور تصادم ایک ہی مشن کے مختلف پہلو بن کر ابھرتے ہیں، اور یہی نکتہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فہمِ سیرت کی اساس ہے۔

سرایا بطور دعوتی، سیاسی اور انقلابی حکمتِ عملی

سرایا کا مطالعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ یہ محض عسکری کاروائیاں نہیں تھیں بلکہ دعوتِ اسلامی کے ایک نہایت اہم اور حکیمانہ مرحلے کی نمائندگی کرتی تھیں۔ ابن ہشام کے مطابق ہجرت کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے مختلف سرایا روانہ فرمائے جن کا مقصد قریش کی عسکری طاقت کو توڑنا نہیں بلکہ انہیں یہ باور کرانا تھا کہ اسلام اب ایک منظم قوت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔[14] اس تناظر میں سرایا دراصل دعوتِ اسلامی کے سیاسی اور نفسیاتی پہلو کا عملی اظہار تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ سرایا کو دعوتی حکمتِ عملی کا لازمی جز قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد خاموش رہنا دعوتی مشن کے منافی تھا، کیونکہ اس سے کفریہ قوتوں کو یہ پیغام ملتا کہ اسلام محض ایک مذہبی تحریک ہے، کوئی انقلابی چیلنج نہیں۔[15] ان کے نزدیک سرایا کا اصل مقصد جنگ چھیڑنا نہیں بلکہ دعوت کے سامنے حائل رکاوٹوں کو ہٹانا تھا۔ قرآن مجید نے اس مرحلے پر مسلمانوں کی ذمہ داری کو یوں واضح کیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ۔[16]

اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بن جاؤ۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ "انصارُ اللہ" بننے کا مطلب محض زبانی تائید نہیں بلکہ عملی جدوجہد ہے، اور سرایا اسی عملی جدوجہد کی ابتدائی صورت تھے۔[17] واقدی کے مطابق بعض سرایا میں قتال سرے سے پیش ہی نہیں آیا، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان مہمات کا مقصد خونریزی نہیں تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس نکتے کو بنیاد بنا کر یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ اگر سرایا کا مقصد محض جنگ ہوتا تو ان کی نوعیت مستقل عسکری معرکوں کی ہوتی، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سرایا کے ذریعے دعوتِ اسلامی کو تین بنیادی فوائد حاصل ہوئے:

- اوّل: مسلمانوں کی نفسیاتی تربیت اور عسکری تیاری۔
- دوم: مخالف قوتوں پر دباؤ۔
- سوم: دعوتِ دین کے لیے راستے کی ہمواری۔

قرآن مجید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ۔[18]

اور کفار سے مقابلے کے لیے قوت تیار رکھو۔

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہاں "قوۃ" سے مراد ہر وہ صلاحیت ہے جو دشمن کو مرعوب کرے۔[19] ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس مفہوم کو دعوتی تناظر میں یوں واضح کرتے ہیں کہ قوت کا اظہار بذاتِ خود دعوت کا حصہ ہے، کیونکہ یہ باطل کو چیلنج کرتا ہے اور حق کی سنجیدگی کو ثابت کرتا ہے۔[20]

دعوت و تبلیغ کا انقلابی تصور اور منہجِ انقلابِ نبوی کا فکری ڈھانچہ

ڈاکٹر اسرار احمد کے فکری نظام میں دعوت و تبلیغ کا تصور روایتی مذہبی وعظ سے یکسر مختلف اور انقلابی ہے۔ وہ "دین" اور "مذہب" کے درمیان ایک بنیادی فرق قائم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک "مذہب" ایک محدود اصطلاح ہے جو صرف فرد کی نجی زندگی، عقائد اور چند رسومات تک محدود ہے، جبکہ "دین" ایک ہمہ گیر نظام (Politico-socio-economic system) کا نام ہے جو پورے معاشرے پر غلبہ چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے لیکچر "دین کی تبلیغ اور انقلاب" میں واضح کرتے ہیں کہ تبلیغ کی دو قسمیں ہیں: ایک "افقی تبلیغ (Horizontal Propagation) "جو خربوزے کی بیل کی طرح زمین پر پھیلتی ہے اور لوگوں کو انفرادی طور پر نیکی کی طرف بلاتی ہے، اور دوسری "انقلابی یا عمودی تبلیغ (Vertical/Revolutionary Propagation) " جو آم کے درخت کی طرح جڑیں پکڑتی ہے اور پھر پورے نظام کو اپنے سائے میں لے لیتی ہے۔ ان کے نزدیک مروجہ تبلیغی کام اگرچہ مفید ہے لیکن وہ نظام کو بدلنے کا کوئی نقشہ نہیں رکھتا، جبکہ نبوی دعوت کا اصل مقصد باطل نظام (Status Quo) کو فکری اور سیاسی چیلنج دینا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے سیرتِ نبویؐ کے عمیق مطالعے سے "منہجِ انقلاب" کے چھ بنیادی مراحل اخذ کیے ہیں جو کسی بھی دور میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے ناگزیر ہیں۔ پہلا مرحلہ 'انفرادی دعوت' کا ہے جس میں لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ دعوت ہمیشہ ایک ٹھوس نظریے پر ہونی چاہیے، جیسا کہ مکہ میں "توحید" کے نظریے نے مشرکانہ سماجی اور سیاسی ڈھانچے کو براہِ راست چیلنج کیا تھا۔ وہ اپنے لیکچر "منہجِ انقلابِ نبویؐ" میں رقمطراز ہیں:

> دعوت وہی ہے جو وقت کے جاہلانہ سیاسی و معاشی نظام کو براہِ راست فکری چیلنج دے، ورنہ وہ محض روایتی وعظ و نصیحت بن کر رہ جاتی ہے جس سے ظالم نظام کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔[21]

ان کے نزدیک دعوت کا اصل منبع صرف قرآن مجید ہونا چاہیے اور وہ اسے "جہاد بالقرآن" کا نام دیتے ہیں، جس کا تذکرہ وہ سورہ الفرقان کی آیت 52 (وجاهدهم به جهاداً كبيرا) کی تشریح میں کثرت سے کرتے تھے۔

دوسرا مرحلہ "تنظیم" ہے، جس میں بیعتِ سمع وطاعت کے ذریعے ایک ڈسپلنڈ جماعت تیار کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ایک ہجوم کبھی انقلاب نہیں لا سکتا، اس کے لیے ایک ایسی عسکری و سیاسی تنظیم ضروری ہے جس میں امیر کی اطاعت کا پختہ جذبہ موجود ہو۔ وہ سورہ الصف کی آیت 14 (كونوا انصار الله) کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ ایک داعی کی پکار پر جو لوگ لبیک کہتے ہیں، وہ فطری طور پر اس کے امیر بننے پر متفق ہو کر ایک بیعت کے رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ تیسرا مرحلہ 'تربیت' ہے، جہاں کارکنوں کا اخلاقی تزکیہ اور ذہنی پختگی پیدا کی جاتی ہے۔ اس تربیتی عمل کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ایک "منتخب نصاب" مرتب کیا جس

میں سورہ العصر (کامیابی کا معیار)، سورہ لقمان کا دوسرا رکوع (حکمتِ دعوت)، اور سورہ حم السجدہ کی آیات 30 تا 36 (استقامتِ داعی) شامل ہیں جو ایک انقلابی کو ہر قسم کی آزمائش کے لیے تیار کرتی ہیں۔

اگلا مرحلہ "صبر محض" کا ہے، جو مکہ کی زندگی میں مسلمانوں نے اختیار کیا۔ اس میں انقلابی جماعت پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں لیکن انہیں ہاتھ اٹھانے یا جوابی کارروائی کی اجازت نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق اس کے تین بڑے تزویراتی مقاصد ہیں۔ پہلا یہ کہ انقلابیوں کے عزم کو فولاد بنایا جائے، دوسرا یہ کہ معاشرے کی خاموش اکثریت کی اخلاقی ہمدردیاں مظلوموں کے ساتھ ہو جائیں اور تیسرا یہ کہ مخالفین کا اخلاقی دیوالیہ پن پوری دنیا پر ظاہر ہو جائے۔ وہ سورہ النساء کی آیت 77 (کفوا ایدیکم) کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ جب تک جماعت اتنی طاقتور نہ ہو جائے کہ نظام سے ٹکرا سکے، اسے صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جب یہ مرحلہ مکمل ہوتا ہے اور مسلمانوں کو ایک آزاد ریاست (مدینہ) میسر آ جاتی ہے، تو پانچواں مرحلہ اقدام اور مسلح تصادم شروع ہوتا ہے جس کا مظہر غزوات و سرایا ہیں۔ آخری مرحلہ غلبہ دین ہے، جو فتح مکہ کی صورت میں ظاہر ہوا اور جس کے نتیجے میں پرانے ظالمانہ نظام کا مکمل خاتمہ کر کے الٰہی نظام نافذ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول، دعوت اور قتال دو الگ اکائیاں نہیں بلکہ ایک ہی انقلابی سلسلے کے مراحل ہیں جہاں دعوت فکری بیج بوتی ہے اور قتال ان کانٹوں کو صاف کرتا ہے جو اس بیج کی نشوونما میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب شہادتِ حق کے تصور کو دعوت و تبلیغ کی روح قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی تفسیر بیان القرآن میں سورہ الحج کی آخری آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کا منصب شہادتِ علی الناس ہے۔[22] اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی زبان، عمل اور اجتماعی طاقت سے اللہ کے دین کی سچائی کو پوری انسانیت پر ثابت کرنا ہے تاکہ قیامت کے دن اللہ کی حجت تمام ہو سکے۔ ان کے نزدیک اگر امت اس فریضے کو چھوڑ کر محض اپنی ذاتی نجات کی فکر میں لگ جائے تو وہ اللہ کے ہاں سخت جوابدہ ہو گی۔ وہ فرماتے ہیں کہ اقامتِ دین کی یہ ذمہ داری بحیثیت قوم ہم پر عائد ہوتی ہے اور اس کے لیے وہی منہج اختیار کرنا ہو گا جو نبی کریم ﷺ نے غزوات اور سرایا سے پہلے کے مراحل میں عملاً کر کے دکھایا تھا۔ حاصلِ بحث یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک دعوت و تبلیغ کا مقصد محض لوگوں کو مسجد تک لانا نہیں بلکہ انہیں ایک منظم طاقت بنا کر زمین پر اللہ کے نظام کو غالب کرنا ہے۔

غزوات و سرایا: دعوتِ حق کے عسکری، تزویراتی اور تربیتی اثرات

ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک غزوات محض دفاعی جنگیں یا زمین جیتنے کے معرکے نہیں تھے، بلکہ یہ دعوت کے تسلسل کا وہ مقام تھا جہاں قوت کا استعمال ناگزیر ہو گیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب باطل زبان کی دعوت کو طاقت کے زور پر روکنے کی کوشش کرے، تو حق کا فرض ہے کہ وہ اس رکاوٹ کو پاش پاش کر دے تاکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لایا جا سکے۔ آپ غزوہ بدر کو دعوت کے مرحلہ اقدام کا پہلا بڑا سنگِ میل قرار دیتے ہیں۔ وہ بیان القرآن میں سورہ الانفال کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بدر کا معرکہ درحقیقت یوم الفرقان تھا جس نے حق اور باطل کے درمیان ایک واضح عسکری لکیر کھینچ دی۔[23]

ڈاکٹر اسرار احمد بدر کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے بدر کے میدان میں 313 نہتے مسلمانوں کو ایک ہزار کے مسلح لشکر پر جو فتح عطا کی، اس کا اصل مقصد لیحق الحق ویبطل الباطل (تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل مٹ جائے) تھا۔ یہ معرکہ ثابت کرتا ہے کہ جب ایک جماعت اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نکلتی ہے تو اللہ کی نصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ مصنف صاحب بدر کی رات حضور ﷺ کی اس دعا کا ذکر بھی کثرت سے کرتے تھے کہ اے اللہ! اگر یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر زمین پر تیرا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا، جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ جنگ صرف بقا کی نہیں بلکہ توحیدِ الٰہی کی دعوت کو بچانے کی تھی۔

غزوہ احد کے حوالے سے ان کا تجزیہ تربیتی اور تنقیدی ہے۔ ان کے نزدیک احد انقلابی جماعت کے نظم وضبط، سمع وطاعت اور مرکز کی اطاعت کی آزمائش کا نام ہے۔ وہ بیان القرآن میں سورہ آل عمران کی آیات 152 تا 200 کی تشریح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کس طرح نظم وضبط میں معمولی سی لغزش دعوت کے عظیم مقصد کو عارضی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> احد میں مسلمانوں کو جو عارضی ہزیمت اٹھانی پڑی، اس کی بنیادی وجہ وہ انفرادی اجتہاد تھا جس نے مرکز کے حکم کی اطاعت میں خلل ڈالا۔ دعوت کی کامیابی کے لیے سمع وطاعت اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ نماز میں صف بندی۔ اللہ نے اس واقعے کے ذریعے انقلابی جماعت کی چھانٹی کی تاکہ خالص لوگ باقی رہ جائیں۔[24]

ڈاکٹر صاحب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ احد کا سبق یہ ہے کہ داعی کو مالِ غنیمت یا دنیاوی مفادات سے بالاتر ہو کر صرف رضائے الٰہی کے لیے اپنے امیر کے حکم پر جان دینی چاہیے۔ غزوہ احزاب (خندق) اور تبوک کو ڈاکٹر احمد استقامت اور نفاق کے خاتمے کے مراحل قرار دیتے ہیں۔ احزاب کے موقع پر وہ اللہ پر کامل بھروسے اور تزویراتی حکمتِ عملی (خندق کھودنا) کے امتزاج کو مثالی قرار دیتے ہیں۔ جبکہ غزوہ تبوک کے حوالے سے ان کا تجزیہ ہے کہ یہ "انفصال" یا سچے مومن اور منافق کے درمیان آخری تمیز کا مرحلہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب سورہ التوبہ کی روشنی میں رقمطراز ہیں:

> تبوک کی پکار نے ثابت کر دیا کہ غلبہ دین کے لیے صرف وہی لوگ موزوں ہیں جو شدید گرمی اور طویل سفر میں بھی اپنے امیر کے ایک اشارے پر نکل کھڑے ہوں۔ جو لوگ پیچھے رہ گئے، وہ اپنی جانوں کو اللہ کے حوالے کرنے کے دعوے میں جھوٹے ثابت ہوئے۔[25]

ان غزوات سے صاحب مصنف نے انقلابی کارکن کے چار بنیادی اوصاف اخذ کیے ہیں:

- پہلا سمع وطاعت (نظم وضبط)
- دوسرا انفاق فی سبیل اللہ (مالی قربانی)
- تیسرا ہجرت ونصرت (ایثار کا جذبہ)
- چوتھا شوقِ شہادت (موت کے خوف سے آزادی)۔

سرایا (چھوٹی عسکری مہمات) کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ درحقیقت "تزویراتی دعوت" کا حصہ تھے۔ ان مہمات کا مقصد مشرکینِ مکہ کی معاشی شہ رگ تجارتی راستوں کو مفلوج کرنا اور قبائلِ عرب پر مسلمانوں کی دھاک بٹھانا تھا تاکہ دعوت کے پھیلنے کے لیے نفسیاتی راستہ صاف ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے سیرت کے مطالعے سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ حضور ﷺ نے ہجرت کے فوراً بعد سرایا بھیجنے میں جلدی کی، جیسا کہ حضرت حمزہؓ کی قیادت میں بھیجا جانے والا پہلا دستہ، تاکہ دشمن کو نفسیاتی طور پر دباؤ میں رکھا جائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ اب اسلام ایک مغلوب طاقت نہیں بلکہ ایک ابھرتی ہوئی عسکری ریاست ہے۔[26] ان سرایا کے دعوتی مقاصد میں دفاعی استحکام قبائل سے معاہدات اور مشرکین کی معاشی ناکہ بندی شامل تھی، جو درحقیقت دعوت بذریعہ رعب کی ایک صورت تھی تاکہ باطل جنگ سے پہلے ہی شکست تسلیم کر لے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک نبی کریم ﷺ کی زندگی کے مدنی دور میں پیش آنے والے غزوات وسرایا محض دفاعی جنگیں یا زمین جیتنے کی مہمات نہیں تھیں، بلکہ یہ اس ہمہ گیر انقلابی عمل کا پانچواں اور فیصلہ کن مرحلہ تھا جسے وہ اقدام اور مسلح تصادم کا نام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی شہرہ آفاق تفسیر بیان القرآن اور بصیرت افروز لیکچر سیریز منہجِ انقلابِ نبویؐ میں واضح کرتے ہیں کہ

جب دعوت و تبلیغ کے ذریعے ایک نظریاتی جماعت تیار ہو گئی اور اسے مدینہ میں ایک آزاد ریاست میسر آ گئی، تو اب باطل نظام کے ساتھ حتمی ٹکراؤ ناگزیر تھا تاکہ اللہ کی زمین پر انسانوں کی بادشاہت ختم کر کے اللہ کی حاکمیت قائم کی جا سکے۔ ان کے نزدیک غزوات و سرایا کے دعوتی اثرات کو تین بنیادی پہلوؤں یعنی عسکری، تزویراتی اور تربیتی نقطہ نظر سے سمجھنا ضروری ہے۔ ان کے نزدیک غزوات کا سب سے بڑا عسکری اثر اتمامِ حجت اور شہادتِ علی الناس کی تکمیل تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب باطل زبان کی دعوت کو طاقت کے زور پر روکتا ہے، تو حق کا فرض ہے کہ وہ عسکری طاقت کے ذریعے اس رکاوٹ کو ہٹا دے۔

جراحی عمل کا تصور

ڈاکٹر صاحب نے ایک نہایت منفرد تحقیقی نکتہ پیش کیا کہ غزوات دراصل انسانیت کے جسم سے کفر و شرک کے ناسور کو نکالنے کے لیے ایک کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس طرح ایک ڈاکٹر مریض کی جان بچانے کے لیے اس کے جسم کے کسی حصے کو کاٹ دیتا ہے، اسی طرح حضور ﷺ نے غزوات کے ذریعے ان مفسد عناصر کا خاتمہ کیا جو اللہ کے دین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔

تزویراتی اثرات اور معاشی و نفسیاتی دباؤ

تزویراتی لحاظ سے ڈاکٹر صاحب سرایا (وہ مہمات جن میں حضور ﷺ نے خود شرکت نہیں کی) کو "پروایکٹو" دعوتی حکمتِ عملی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سرایا کا مقصد دشمن کو مدینہ پر حملہ کرنے سے پہلے ہی نفسیاتی طور پر مفلوج کر دینا تھا چنانچہ اپنے لیکچر "جادہ و منزل" میں فرماتے ہیں کہ ہجرت کے فوراً بعد حضور ﷺ نے سرایا بھیجنے میں اس لیے جلدی کی تاکہ قریش مکہ کی معاشی شہ رگ یعنی شام کی تجارتی گزرگاہوں کو بند کیا جا سکے۔ آپ ﷺ نے حضرت حمزہؓ کی قیادت میں ہجرت کے محض چھ ماہ بعد پہلا دستہ روانہ کیا تاکہ کفارِ مکہ کی شامی تجارت میں رکاوٹ ڈالی جائے اور وہ صلح پر مجبور ہو جائیں۔ یہ دراصل دعوت بذریعہ رعب تھی تاکہ دشمن کو معلوم ہو جائے کہ اب مسلمان ایک عسکری ریاست کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔[27]

ڈاکٹر صاحب نے منہجِ انقلابِ نبویؐ میں سریہ عبداللہ بن جحشؓ (واقعۂ نخلہ) کی مثال دیتے ہوئے عسکری رازداری اور تزویراتی انٹیلی جنس کی اہمیت واضح کی ہے۔ حضور ﷺ نے ایک بند خط دے کر انہیں روانہ کیا، جس کا مقصد قریش کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا تھا۔ آپ کے نزدیک یہ تزویراتی اقدامات دعوتِ حق کے استحکام اور مدینہ کی دفاعی سرحدوں کو محفوظ بنانے کی خاطر تھے۔

جہاد بالقرآن اور عصرِ حاضر میں اقامتِ دین کی سعیِ پیہم

ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک موجودہ دور میں مسلمانوں کا سب سے بڑا فریضہ "جہاد بالقرآن" ہے جو فکری و نظریاتی محاذ پر لڑا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تلوار کا جہاد تو ریاست کی موجودگی اور مخصوص حالات میں ہوتا ہے، لیکن قرآن کے ذریعے دعوت اور فکری انقلاب کا جہاد دائمی ہے جس سے کسی دور میں مفر نہیں۔ وہ اپنے رسالے جہاد بالقرآن میں لکھتے ہیں:

> قرآن مجید خود پکار پکار کر کہتا ہے 'وجاہدہم بہ جہاداً کبیرا' (سورہ الفرقان: ۵۲)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دورِ حاضر کے ملحدانہ اور مشرکانہ افکار کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ اور قرآن کی دلیل سے ان کے باطل قلعوں کو پاش پاش کر دو۔ یہی وہ جہاد ہے جو مکہ کی گلیوں میں بھی جاری تھا اور آج بھی جاری ہے۔[28]

صاحب بیان القرآن نے اس جہاد کے پانچ بنیادی محاذ بیان کیے ہیں جن میں نفس کے خلاف جہاد تزکیہ، شیطان کے خلاف جہاد، فکری و نظریاتی جہاد فلسفہ و سائنس کی روشنی میں، تبلیغی جہاد پیغام کی اشاعت، اور سیاسی جہاد نظامِ حق کے غلبے کی سعی شامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس تاریخی اعتراض کا بھی مدلل جواب دیتے ہیں کہ کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟ وہ فرماتے ہیں کہ اسلام کا عقیدہ ہمیشہ دعوت، اخلاق اور دلائل سے پھیلا ہے کیونکہ دلوں کو تلوار سے فتح نہیں کیا جاسکتا، لیکن اسلام کا نظام اور قانون ہمیشہ طاقت سے قائم ہوا ہے۔ غزوات کا مقصد لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں تھا، بلکہ اس ظالمانہ سیاسی و معاشی نظام (طاغوت) کو ختم کرنا تھا جو لوگوں کو اللہ کی بندگی سے روک رہا تھا۔ بیان القرآن میں وہ سورہ المائدہ کی آیت 67 "یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک" کی تشریح میں فرماتے ہیں:

> تبلیغ کا حکم عام ہے، لیکن جب یہ پیغام ان مقتدر طبقات (Vested Interests) تک پہنچتا ہے جو لوگوں کا استحصال کر رہے ہوتے ہیں، تو وہ اسے اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھ کر مزاحمت کرتے ہیں۔ اس مزاحمت کو ختم کرنا ہی جہاد و قتال ہے تاکہ انسانوں کو بادشاہوں کی غلامی سے نکال کر کائنات کے حقیقی بادشاہ کی بندگی میں لایا جائے۔[29]

آج کے دور میں نبوی منہج دعوت کے عملی اطلاق کے لیے ڈاکٹر صاحب نے تنظیم اسلامی اور مرکزی انجمن خدام القرآن کی بنیاد رکھی تاکہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جو موجودہ جاہلی نظام کے مقابلے میں خلافتِ راشدہ کے نقشِ قدم پر نظامِ حق قائم کر سکے۔ ان کے نزدیک مروجہ انتخابی سیاست سے حقیقی تبدیلی نہیں آسکتی کیونکہ وہ "گیو اینڈ ٹیک" اور مفادات کا کھیل ہے جو نظام کو جڑوں سے نہیں بدلتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں غلبہ دین کے لیے وہی راستہ اپنانا ہوگا جو غزوات و سرایا کی روشنی میں واضح ہوتا ہے: پہلے قرآن کے ذریعے فکری بیداری پیدا کرنا، پھر ایک امیر کی بیعت میں منظم ہونا اور پھر صبر کے ساتھ باطل نظام کے خلاف پرامن لیکن مستحکم جدوجہد کرنا یہاں تک کہ اللہ کی مدد سے نظام کی تبدیلی کا موقع میسر آجائے۔ ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی اس عزم کی عکاس تھی کہ اللہ کی زمین پر صرف اللہ کا حکم چلنا چاہیے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی تحقیق ہمیں یہ بتاتی ہے کہ دعوت اور قتال دو الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی انقلابی عمل کے تدریجی مراحل ہیں۔ دعوت مکہ میں صبر کی صورت میں فکری بنیادیں فراہم کر رہی تھی اور مدینہ میں غزوات و سرایا کے ذریعے اس نظریے کو ایک فاتح نظام کی صورت میں نافذ کر دیا گیا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے افکار کی روشنی میں تجزیہ

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک سرایا دراصل دعوتِ محمدی ﷺ کے اس مرحلے کی علامت ہیں جہاں حق نے باطل کے ساتھ براہِ راست مکالمہ ترک کر کے عملی محاذ اختیار کیا۔ وہ اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ اگر اسلام کو محض اخلاقی اصلاح تک محدود سمجھ لیا جائے تو سرایا کی کوئی توجیہ باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ سرایا اس امر کا ثبوت ہیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے جو اپنی بقا اور غلبے کے لیے قوت کے استعمال کو بھی دعوت کا حصہ سمجھتا ہے، بشرطیکہ وہ اللہ کے حکم اور اخلاقی حدود کے اندر ہو۔ یہی تصور آگے چل کر غزوات کی صورت میں زیادہ واضح اور فیصلہ کن انداز میں سامنے آتا ہے، جہاں دعوت اور تصادم ایک دوسرے سے مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

غزواتِ بدر، اُحد اور احزاب: دعوت سے تصادم تک

غزوۂ بدر اسلامی تاریخ کا پہلا باقاعدہ معرکہ ہے جس میں دعوتِ اسلامی اور نظامِ کفر آمنے سامنے آئے۔ ابن ہشام کے مطابق یہ معرکہ محض ایک تجارتی قافلے کے تعاقب سے شروع ہوا، مگر حالات کے جبر نے اسے حق و باطل کے فیصلہ کن تصادم میں تبدیل کر دیا۔[30] قرآن مجید نے اس موقع پر اہلِ ایمان کی نفسیاتی کیفیت اور الٰہی نصرت کو نمایاں انداز میں بیان کیا:

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ۔[31]

اور یقیناً اللہ نے تمہاری بدر میں مدد کی جب تم کمزور تھے۔

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ بدر میں مسلمانوں کی قلتِ تعداد اور وسائل کے باوجود فتح اس لیے نصیب ہوئی کہ یہ معرکہ اللہ کے دین کے غلبے کے لیے تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ بدر کو اسلامی انقلاب کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہاں پہلی مرتبہ دعوت نے محض نظری چیلنج سے آگے بڑھ کر عملی قوت کے ساتھ باطل کو للکارا۔[32] قرآن مجید نے غزوۂ بدر کے مقصد کو یوں واضح کیا:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔[33]

کہ جو ہلاک ہو دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیے دلیل سے جیے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ بدر میں اصل فیصلہ تلوار سے پہلے حق و باطل کے واضح ہو جانے کا تھا، تاکہ بعد میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔[34] ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک غزوۂ بدر اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اسلام میں جہاد دعوت کا متبادل نہیں بلکہ اس کا لازمی تسلسل ہے۔ اگر کفر یہ نظام دعوت کے راستے میں رکاوٹ بن جائے تو تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بدر نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ اسلامی دعوت اپنی بقا اور غلبے کے لیے منظم قوت کے استعمال سے گریز نہیں کرتی، بشرطیکہ مقصد خالصتاً اللہ کے دین کی سربلندی ہو۔[35]

غزوۂ اُحد

غزوۂ اُحد کو عام طور پر عسکری شکست کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے، مگر دعوتی اعتبار سے یہ غزوہ نہایت اہم تربیتی مرحلہ ہے۔ ابن ہشام کے مطابق مسلمانوں کو ابتدائی کامیابی کے باوجود اس وقت نقصان اٹھانا پڑا جب بعض تیر اندازوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ قرآن مجید نے اس واقعے کی تفصیل اور اسباب کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ۔[36]

اور بیشک اللہ نے تمہیں اپنا وعدہ سچا کر دکھایا جب تم اس کے حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم نے بزدلی دکھائی۔

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اُحد میں شکست دراصل مسلمانوں کے لیے ایک اخلاقی اور تنظیمی سبق تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ انقلاب محض جذبے سے نہیں بلکہ نظم و اطاعت سے کامیاب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک اُحد میں پیش آنے والا واقعہ دعوتی جماعت کی تربیت کا ایک ناگزیر مرحلہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر اس مرحلے پر جماعت کو نظم کی اہمیت نہ سکھائی جاتی تو آئندہ مراحل میں انقلاب خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ چنانچہ اُحد کی شکست بظاہر ناکامی ہونے کے باوجود دعوتی جدوجہد میں ایک کامیاب اصلاحی مرحلہ ثابت ہوئی۔[37]

غزوۂ احزاب

غزوۂ احزاب اس مرحلے کی نمائندگی کرتا ہے جب دعوتِ اسلامی کے خلاف تمام باطل قوتیں متحد ہو گئیں۔ واقدی کے مطابق قریش، یہود اور دیگر قبائل نے مدینہ پر مشترکہ حملہ کیا۔ قرآن مجید نے اس موقع پر اہلِ ایمان کی کیفیت کو یوں بیان کیا:

وَإِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ۔[38]

جب کافر تم پر تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئے۔

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے لیے سخت ترین آزمائش تھی۔ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے مطابق احزاب میں اصل فتح عسکری نہیں بلکہ نظری اور اخلاقی تھی، کیونکہ دشمن بغیر کسی بڑے معرکے کے پسپا ہو گیا۔[39] ڈاکٹر اسرار احمدؒ احزاب کو دعوتی استقامت کا نقطۂ عروج قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جب اہلِ ایمان صبر، نظم اور اللہ پر توکل کو اپنا شعار بنالیں تو باطل کی متحدہ طاقت بھی شکست کھا جاتی ہے۔ احزاب کے بعد اسلامی دعوت دفاعی مرحلے سے نکل کر فیصلہ کن غلبے کی طرف بڑھتی ہے، جو آگے چل کر فتح مکہ پر منتج ہوتی ہے۔[40]

صلح حدیبیہ

صلحِ حدیبیہ بظاہر ایک معاہدۂ امن تھا، لیکن حقیقت میں یہ دعوتِ اسلامی کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔ ابن ہشام کے مطابق رسول اللہ ﷺ عمرہ کی نیت سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، مگر قریش کی مزاحمت کے باعث حدیبیہ کے مقام پر معاہدہ طے پایا جس کی بعض شرائط ظاہری طور پر مسلمانوں کے لیے سخت محسوس ہوئیں۔ قرآن مجید نے اس معاہدے کو غیر معمولی الفاظ میں "فتح مبین" قرار دیا:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا۔[41]

یقیناً ہم نے آپ کو فتحِ مبین عطا کی۔

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہاں فتح سے مراد عسکری غلبہ نہیں بلکہ وہ امن ہے جس نے دعوتِ اسلام کے لیے راستے کھول دیے۔ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس مقام پر واضح کرتے ہیں کہ حدیبیہ نے دعوت کو تصادم کے دباؤ سے نکال کر فکری اور سماجی پھیلاؤ کا موقع فراہم کیا۔[42] ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک حدیبیہ اسلامی تحریک کی تاریخ میں اسٹریٹجک صبر کی اعلیٰ مثال ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انقلاب ہمیشہ تلوار کے زور پر نہیں آتا بلکہ بعض اوقات پیچھے ہٹنا ہی آگے بڑھنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ حدیبیہ کے بعد دو برس کے اندر اندر اسلام اتنی تیزی سے پھیلا جتنی تیزی مکہ کے تیرہ برس میں بھی نہ ہو سکی۔

غزوۂ خیبر

غزوۂ خیبر اس مرحلے کی نمائندگی کرتا ہے جہاں اسلامی ریاست کو درپیش اندرونی خطرات کو ختم کرنا ضروری ہو چکا تھا۔ واقدی کے مطابق خیبر کے یہودی قبائل مسلسل سازشوں اور دشمنوں کی پشت پناہی میں مصروف تھے۔ قرآن مجید نے اس مرحلے پر اہلِ ایمان کو غلبے کی بشارت دی:

وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا۔[43]

اور اللہ نے تم سے وعدہ کیا ہے بہت سی غنیمتوں کا کہ تم لوگے۔

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ خیبر کی فتح نے اسلامی ریاست کو معاشی استحکام فراہم کیا۔ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک خیبر کی فتح دعوتی اعتبار سے اس لیے اہم ہے کہ اس سے وہ قوتیں بے اثر ہو گئیں جو خفیہ طور پر دعوتِ اسلامی کے خلاف کام کر رہی تھیں۔[44] ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے مطابق خیبر کی فتح محض ایک عسکری کامیابی نہیں بلکہ دعوت کے تحفظ کا مرحلہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب تک اندرونی سازشوں کا قلع قمع نہ کیا جائے، دعوت نہ تو محفوظ رہ سکتی ہے اور نہ ہی آگے بڑھ سکتی ہے۔ خیبر کے بعد اسلامی ریاست ایک مستحکم بنیاد پر کھڑی ہو گئی۔

فتح مکہ

فتح مکہ کو اسلامی دعوت کی تکمیل اور غلبۂ دین کا عملی مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابن ہشام کے مطابق رسول اللہ ﷺ تقریباً دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے، مگر عمومی معافی کا اعلان فرمایا۔ قرآن مجید نے اس موقع پر اعلان فرمایا:

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔[45]

حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔

ابن کثیر کے مطابق یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر حق کے مکمل غلبے کی علامت ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک فتح مکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی انقلاب کا اصل مقصد انسانوں کو زیر کرنا نہیں بلکہ دلوں کو فتح کرنا ہے۔[46] ڈاکٹر اسرار احمدؒ فتح مکہ کو دعوتی جدوجہد کا نقطۂ عروج قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہاں قوت اور اخلاق ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ دشمنوں کو معاف کر دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی دعوت کا مقصد انتقام نہیں بلکہ ہدایت ہے۔ فتح مکہ کے بعد اسلام محض ایک تحریک نہیں رہا بلکہ پورے جزیرۂ عرب کا غالب نظام بن گیا۔[47]

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا جامع تصورِ دعوت

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک دعوتِ اسلامی، جہاد اور غلبۂ دین تین الگ الگ تصورات نہیں بلکہ ایک ہی ہمہ گیر مشن کے باہم مربوط مراحل ہیں۔ وہ سیرتِ نبوی ﷺ اور قرآنِ مجید کی روشنی میں اس تصور کو واضح کرتے ہیں کہ اسلام محض فرد کی اصلاح کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا انقلابی نظام ہے جو بالآخر اجتماعی سطح پر اللہ کی حاکمیت قائم کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے مشن کو یوں بیان کیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ۔[48]

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس آیت کو اسلامی انقلاب کا جامع ترین قرآنی بیان قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس میں دعوت (الہدیٰ)، نظامِ حیات (دین الحق) اور غلبہ (لِيُظْهِرَهُ) تینوں عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔[49] ان کے نزدیک دعوت کا پہلا مرحلہ ایمان، تزکیہ اور تربیت ہے، جس کی بنیاد مکی دور میں رکھی گئی۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ اگر یہ بنیاد مضبوط نہ ہو تو جہاد محض طاقت کا استعمال بن کر رہ جاتا ہے، جبکہ اسلام میں جہاد اخلاقی اور دعوتی حدود کا پابند ہے۔[50] قرآن مجید اسی تدریج کی طرف اشارہ کرتا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا۔[51]

یقیناً کامیاب ہوا وہ جس نے اسے پاک کر لیا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے مطابق مدنی دور میں جب ایک منظم جماعت اور ریاست وجود میں آ گئی تو جہاد کا مرحلہ شروع ہوا۔ وہ جہاد کو "دعوت کا محافظ" قرار دیتے ہیں، نہ کہ اس کا متبادل۔ ان کے الفاظ میں جہاد اس وقت فرض ہوتا ہے جب باطل قوتیں دعوت کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں۔[52] ڈاکٹر اسرار احمدؒ غلبۂ دین کو اسلامی دعوت کی منطقی انتہا قرار دیتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر اسلام کو غالب نظام بننے کا حق نہ دیا جائے تو اس کی جامعیت عملاً معطل ہو جاتی ہے۔ فتح مکہ کو وہ غلبۂ دین کی عملی مثال قرار دیتے ہیں، جہاں طاقت کے باوجود عفو و درگزر کو اختیار کیا گیا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ سورۃ النصر کو رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل کا اعلان قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہاں دعوت، جہاد اور غلبہ ایک مکمل دائرے کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔[53]

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فہم کے مطابق عصرِ حاضر میں دعوتِ اسلامی کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے صرف وعظ و تبلیغ تک محدود کر دیا گیا ہے، جبکہ اس کے اجتماعی اور انقلابی پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ وہ بارہا اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جب تک دعوت کو ایک منظم جدوجہد اور طویل المدت حکمتِ عملی کے ساتھ نہ جوڑا جائے، اس کے ثمرات ظاہر نہیں ہو سکتے۔[54] یہ جامع تصورِ دعوت و جہاد ہی دراصل غزوات و سرایا کے صحیح فہم کی کلید ہے، کیونکہ ان کے بغیر اسلامی تاریخ کو یا تو محض جنگی داستان بنا دیا جاتا ہے یا محض اخلاقی موعظت تک محدود کر دیا جاتا ہے، جبکہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا منہج ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک متوازن اور قرآنی راستہ پیش کرتا ہے۔

عصرِ حاضر کے لیے غزوات و سرایا سے اخذ کردہ دعوتی اصول

عصرِ حاضر میں دعوتِ اسلامی کو جن فکری، سیاسی اور سماجی چیلنجز کا سامنا ہے، ان کی نوعیت اگرچہ تاریخی طور پر مختلف ہے، تاہم ان کی اصل روح وہی ہے جو عہدِ نبوی ﷺ میں باطل نظاموں کی صورت میں موجود تھی۔ غزوات و سرایا کا مطالعہ محض تاریخی واقعات کے طور پر نہیں بلکہ دعوتی اصولوں کے منبع کے طور پر کیا جائے تو یہ عصرِ حاضر کے داعیانِ اسلام کے لیے گہری رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک سیرتِ نبوی ﷺ کا اصل فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اسے نمونۂ انقلاب کے طور پر سمجھا جائے، نہ کہ صرف تبرک یا تاریخ کے طور پر۔ عصرِ حاضر کا پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ دعوت کو مرحلہ وار اور منظم جدوجہد کے طور پر اختیار کیا جائے۔ مکی دور کی مثال واضح کرتی ہے کہ فرد سازی، ایمان کی پختگی اور اخلاقی تربیت کے بغیر اجتماعی تبدیلی ممکن نہیں۔ قرآن مجید نے اسی ترتیب کو یوں بیان کیا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔[55]

وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس آیت کو دعوت کے نصابِ اوّل قرار دیتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیم کے بغیر انقلاب کا خواب محض رومانویت بن جاتا ہے۔[56]

دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ دعوت کو اجتماعی سطح پر منظم کیے بغیر اس کے ثمرات ظاہر نہیں ہوتے۔ سرایا اور غزوات اس حقیقت کا عملی اظہار تھے کہ دعوت ایک جماعت، قیادت اور نظم کی محتاج ہے۔ غزوۂ اُحد کے تجربے سے یہ سبق ملتا ہے کہ نظم و اطاعت کے بغیر حتیٰ کہ حق کی جماعت بھی وقتی نقصان اٹھا سکتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس تناظر میں جماعتی نظم کو اسلامی تحریک کی روح قرار دیتے ہیں۔[57]

عصرِ حاضر میں ایک اہم مغالطہ یہ ہے کہ دعوت اور سیاست کو الگ الگ دائروں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ غزوات و سرایا اس تقسیم کی نفی کرتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت بیک وقت فکری، اخلاقی، سیاسی اور عسکری پہلو رکھتی تھی۔ قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو اجتماعی قوت بننے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔[58]

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک یہ آیت اسلامی تحریک کے اجتماعی مزاج کی اساس ہے، اور غزوات و سرایا اسی اجتماعی قوت کا

مظہر تھے۔[59] ایک اور بنیادی اصول یہ ہے کہ قوت کا استعمال دعوت کا متبادل نہیں بلکہ اس کا محافظ ہے۔ عصرِ حاضر میں جہاد کے تصور کو یا تو مکمل طور پر رد کر دیا جاتا ہے یا انتہا پسندانہ تعبیر میں پیش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ ان دونوں رویّوں کو قرآن و سیرت کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق جہاد کا مقصد فتنہ کا خاتمہ اور دعوت کے لیے ساز گار ماحول پیدا کرنا ہے، نہ کہ جبر کے ذریعے دین مسلط کرنا۔ غزوات و سرایا سے اخذ ہونے والا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ دعوت کا ہدف بالآخر غلبۂ دین ہے، مگر اس غلبے کا طریقہ اخلاقی حدود کا پابند ہوتا ہے۔ فتح مکہ کی مثال عصرِ حاضر کے لیے یہ واضح پیغام رکھتی ہے کہ طاقت حاصل ہونے کے بعد انتقام نہیں بلکہ عفو، عدل اور اصلاح کو ترجیح دی جائے۔ قرآن مجید نے اس اخلاقی غلبے کو یوں بیان کیا:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔[60]

اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس آیت کو اسلامی انقلاب کے اخلاقی دائرے کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ اگر غلبہ رحمت کے بغیر ہو تو وہ اسلامی نہیں رہتا۔[61] عصرِ حاضر کے داعیانِ اسلام کے لیے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ دعوت کو وقتی ردِ عمل کے بجائے طویل المدت جدوجہد کے طور پر اپنایا جائے۔ غزوات و سرایا ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ اسلامی دعوت صبر، حکمت، قربانی اور مسلسل محنت کا تقاضا کرتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے مطابق یہی وہ منہج ہے جو امتِ مسلمہ کو دوبارہ اس کے اصل مقام تک پہنچا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ سیرتِ نبوی ﷺ کو ایک زندہ اور متحرک نمونہ سمجھ کر اپنائے۔

References

1 Al-Qurʾān 33:9 -
2 Iṣrār Aḥmad, Dr., *Bayān al-Qurʾān* (Peshawar: Anjuman Khuddām al-Qurʾān, 2009), 4:382.
3 Al-Qurʾān 16:125.
4 Iṣrār Aḥmad, *Sīrat al-Nabī ﷺ: Inqilābī Jadd-o-Juhd* (Peshawar: Anjuman Khuddām al-Qurʾān, 2007), 58.
5 Al-Qurʾān 22:39.
6 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 3:488.
7 Muḥammad ʿAbd al-Malik Ibn Hishām, *al-Sīrah al-Nabawiyyah* (Lahore: Islāmī Kutub Khānah, n.d.), 1:273.
8 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, Preface.
9 Al-Qurʾān 77:40.
10 Iṣrār Aḥmad, *Sīrat al-Nabī ﷺ: Inqilābī Jadd-o-Juhd*, 65.
11 Al-Qurʾān 39:8.
12 ʿImād al-Dīn Ibn Kathīr, *Tafsīr al-Qurʾān al-ʿAẓīm* (Lahore: Fiqh al-Ḥadīth Publications, 2009), 1:466.
13 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 2:291.
14 Ibn Hishām, *al-Sīrah al-Nabawiyyah*, 2:691.
15 Iṣrār Aḥmad, *Sīrat al-Nabī ﷺ: Inqilābī Jadd-o-Juhd*, 69.
16 Al-Qurʾān 14:61.
17 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 6:442.
18 Al-Qurʾān 60:8.
19 Ibn Kathīr, *Tafsīr al-Qurʾān al-ʿAẓīm*, 2:379.
20 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 2:458.
21 Iṣrār Aḥmad, *Minhaj-e Inqilāb-e Nabawī*, 72.
22 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 3:571.
23 Ibid., 3:41.
24 Ibid., 2:318.
25 Ibid., 3:338.
26 Iṣrār Aḥmad, *Jādah wa Manzil* (Lahore: Maktabah Khuddām al-Qurʾān, 2006), 26.
27 Ibid., 29.
28 Iṣrār Aḥmad, *Risālah: Jihād bi-al-Qurʾān* (Peshawar: Maktabah Anjuman Khuddām al-Qurʾān), 25.
29 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 2:342.
30 Ibn Hishām, *al-Sīrah al-Nabawiyyah*, 2:334.
31 Al-Qurʾān 3:123.
32 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 2:378.
33 Al-Qurʾān 8:42.
34 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 2:249.
35 Iṣrār Aḥmad, *Sīrat al-Nabī ﷺ: Inqilābī Jadd-o-Juhd*, 38.
36 Al-Qurʾān 3:152.
37 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 3:238.
38 Al-Qurʾān 33:10.
39 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 4:110.
40 Iṣrār Aḥmad, *Sīrat al-Nabī ﷺ: Inqilābī Jadd-o-Juhd*, 118.
41 Al-Qurʾān 48:1.
42 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 4:427.
43 Al-Qurʾān 48:20.
44 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 4:152.
45 Al-Qurʾān 17:81.
46 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 5:169.
47 Iṣrār Aḥmad, *Sīrat al-Nabī ﷺ: Inqilābī Jadd-o-Juhd*, 69.
48 Al-Qurʾān 33:9.
49 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 4:402.
50 Iṣrār Aḥmad, *Minhaj Inqilāb-e Nabawī* ﷺ, 48.
51 Al-Qurʾān 9:91.
52 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 2:218.
53 Ibid., 6:482.
54 Iṣrār Aḥmad, *Khuṭbāt-e Khilāfat wa Mulūkiyyat*, 39.

55 Al-Qurʾān 2:62.
56 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 6:309.
57 Iṣrār Aḥmad, Tanẓīm-e Islāmī kā Taʿāruf, 28.
58 Al-Qurʾān 103:3.
59 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 3:251.
60 Al-Qurʾān 21:107.
61 Iṣrār Aḥmad, *Bayān al-Qurʾān*, 5:395.